طلوع اسلام

جلد ۸
شمارہ ۱۲

کراچی: ہفتہ-۲۳-اپریل ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

بیاد گار اقبال

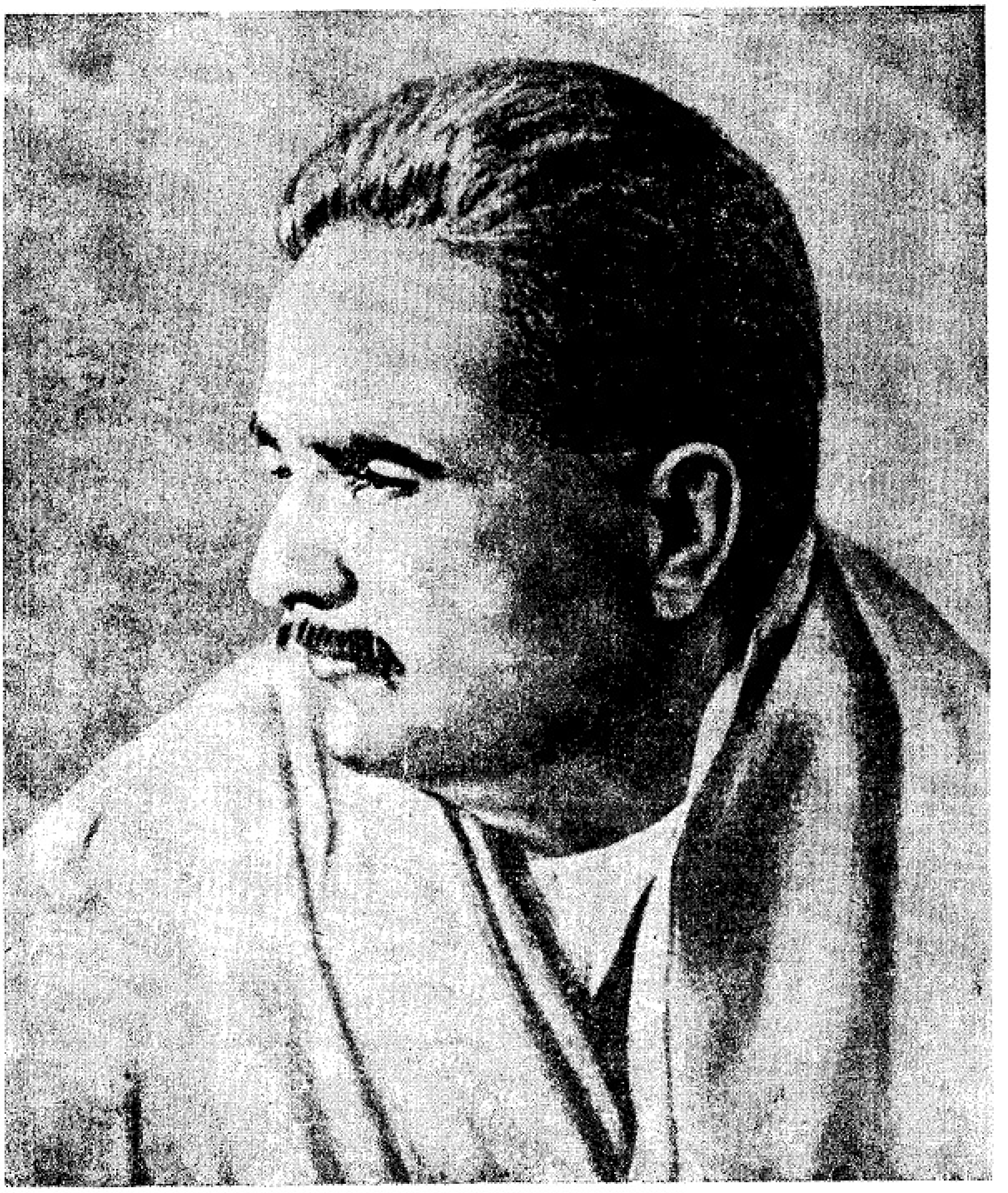

Contents of Tolu-e-Islam Magazine
23 April 1955

مجلس قلندرانِ اقبال	Page 3
نشانِ منزل	Page 5
یومِ اقبال	Page 6
نظامِ پاکستان کے متعلق علامہ اقبال کا خط	Page 7
سرودِ رفتہ	Page 7
جنابِ رسالتمآب کا ادبی تبصرہ	Page 8
مُلکِ خداداد کا تصور	Page 9
اِقبال کا پاکستان	Page 10
روٹی کا مسئلہ	Page 14
کشمیر ـــــ اقبال کی نظر میں	page 16
درِ منثور	Page 18
ضربِ کلیم	Page 20
تلمیحاتِ اقبال	page 25

مجلسِ قلندرانِ اقبال

(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) عبدالرب۔ پرویز۔ عبدالوہاب عزام۔ حفیظ جالندھری
(کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) سراج الحق۔ حمید انصاری۔ عبدالشکور۔ عزیز الحسن۔ عارف حسین۔ خورشید عالم۔ مجیب انصاری

مجلسِ قلندرانِ اقبال

(خورشید)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ سفیر مصر ان سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکت مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر محو تحیر تھے کہ پیغامبر نے کہا کہ ان کے اس شوق ملاقات کا جذبہ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبال سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انھیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت اقبال سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے ضرورت کے موقع پر وہ طالب علمانِ اقبال کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ہلکے سے ردعمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرد تمنائے ملاقات سے قدرتاً پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن پیغامبر سید عبدالواحد صاحب سکریٹری مجلس اقبال نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحب موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانہ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب خود وہاں چلے گئے۔ ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انھیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھیے، شان و شوکت، ٹھاٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان قلم پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بباطن خبیث دختران ادر ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو سود و سودا فکر و فن سے معمور ہے نہ کہ سوز و مستی جذب و شوق سے آباد من کی دنیا۔ اس جہان گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گذر جن کے قلوب و اذہان میں قرآن اور اقبال نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطراب موج کے ساتھ ساتھ سکون گہر بھی ہو۔ جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں، اور جن کی حالت یہ ہو:

زبیرون در گذشتم ز درون خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویز صاحب گئے، اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں میں"۔ سفیر مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی، اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں، وہ درویش خدامست جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا، اس میں سراسر طالب العلمانہ تجسس تھا، دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انھیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے من تو شدم تو من شدی کی حقیقی "الفت بین قلوبکم" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلس قلندران اقبال" کا نقش اول بنی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکان مجلس کی کشت جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا۔ تا آنکہ ایک وقت اسے مجلس قلندرانِ اقبال کہہ دیا گیا، اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہرحال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیام مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے، اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آئندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر از اول تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنھوں نے پیغامبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انھیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انھیں بھی شریک کر لیا جائے۔ لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو آتے رہے اور کبھی کبھی آ جاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریک مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو۔ لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تمنا میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ فضا تھی جس کے بغیر سینے کی کشود ممکن ہے نہ قلب کا حضور۔ اور جب یہ دولت ہاتھ آ جاتی ہے تو کوئی اس کو بہ قیام ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور قلندران اقبال کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیل محالات ہے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع، کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جس کے نزدیک گردش لیل و نہار کا معیار "اوقات جاں بود کہ بیاد یار سپرفت" ہو، انھیں تو ہر وقت یہ خلش احساس رہتی ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد"۔ مجلس کے لئے دن کا کوئی تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کا حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست ہونے سے پیشتر یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات کی۔ انھیں بہرحال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا تھا۔ اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ ورنہ کوئی اور مصروفیت آئندہ یوم انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابل دید ہوا کرتا تھا۔ "آئندہ کب؟" کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں گو انتظار کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب سودا بازی شروع ہو جاتی۔ "چلئے ہم صبح صبح آ جائیں گے۔" "اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آیئے اور پھر شب زمیان ہو گی بہت سا حساب بیباق ہو جائے گا۔" ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی سے کہا "حتیٰ مطلع الفجر"۔ اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ذوق حضور دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے"۔ "یہ نکتہ زیادہ غور طلب ہے"۔ "اسے ایک ہی نشست میں نپٹا لینا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ سب کو رہ رہ کے خیال (اور بہت حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آ رہا ہے۔ سفیر صاحب بار بار فرماتے ہیں کہ مجھے بھی جلدی نہیں، تیار ہو کر چلے جانا ہے چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ــــ تا آنکہ ایک منٹ کا پس و پیش خلاف مصلحت ہو جاتا۔ اور سب بادل نخواستہ اٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطور بالا سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ مجلس قلندران اقبال میں مناصب کی تقسیم نہیں ہو گی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرض وجود میں نہیں لایا گیا، اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام انداز و معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں، اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے، اور اس طریق سے جیسے وہ پہلے سے "مقدر" تھے سب سے بڑا عہدہ پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندراں کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی کہ ہرچند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباس تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبال پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ اور اپنے مطالعہ اقبال اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انھیں شیخ قلندراں کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انھیں "سفیر اقبال" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبال کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلام اقبال کا عربی میں ترجمہ کر کے انھوں نے پوری دنیائے عرب کو فکر اقبال کے نور سے منور کر دیا اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیر اقبال" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا۔ آج وہی ساقی ساقی گری کی شرم رکھ کر اس اجڑی محفل کی یاد کو دل و دماغ میں لیے اس کی داستان گوئی کا فرض ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلا وجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدر ظرفِ عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے۔ وہیں تھے اس وقت انھیں "ملازمین" محض تعارف کے لیے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انھیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا جو ان قلندروں کی رفاقت سے ملتا تھا۔ جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسے ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخ قلندران اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بے ساختہ داد دی گئی۔ اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آ پڑی۔ چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔ ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا۔ تقسیم کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا۔ قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے۔ ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی۔ ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے، پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ پوچھئے نہیں۔ دس بارہ قلندر جن کی "ہر لحظہ نئی شان نئی آن"۔ اسے کم دودھ، اسے تیز قہوہ، یہ اتنی شکر وہ اتنی شکر۔ مجلس قلندران کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملے میں ہوا کرتا تھا کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخی چائے کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہاں کی آزمائش کیا کرتے تھے۔ ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدنظر رکھنا پڑتی تھی۔ ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ قریباً ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ اگر وہ محفل سے پوچھے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو ان کا جواب "بلی" ہوگا۔ قلندروں کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں! یہ قاسم تھے سب کے ہر دلعزیز، "عزیز الحسن"۔

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے یہ ان خدام مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبال کو نہ پا سکے لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے۔ ابراہیم، خمیس، محمود وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدام خانہ تھے وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بے تابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا تھا۔ دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا، وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے۔ یہ ذہنی طور پر چاہے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے۔

ایک عہدے کا اور ذکر کرنا ہے جو آخری ایام میں دیا گیا۔ پرویز صاحب دفتر میں تھے تو سفیر صاحب کی طرف سے عام طور پر ان کو ٹیلیفون پر پروگرام میں کمی بیشی کی اطلاع مل جایا کرتی تھی۔ جب پرویز صاحب نے چھٹی لے لی تو ایک دو قلندر جو ٹیلیفون پر موجود ہوا کرتے تھے اس اطلاع کے لئے منتخب ہوئے۔ آہستہ آہستہ ایام مجلس کا تعین انہی کے سپرد ہو گیا، اور وہی سب کو فرداً فرداً اطلاع بھی کیا کرتے تھے۔ اس سے لامحالہ عہدے کی نام دہی کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھیں "صدر قلندران" کہا جانے لگا۔

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبال کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا مبسوط بیان ہوتا۔ اقبال کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان تخیل علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا۔ وہ نخلستان جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے نخیل بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھ گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا۔ اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعہ اقبال میں مستغرق بحر قرآن کی غواصی کر رہا ہو تو کیا اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو تو کیا۔ وہ "رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز" ہوتا ہے۔ دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر ہے۔ وقفہ چائے میں لطافت و ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی، وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد شمع پھر شیخ قلندراں کے سامنے پہونچ جاتی۔ پرویز صاحب ہمیں ان گذرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گرد راہ بن جاتے اور فلک نے بیں معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں سفیر اقبال "زمین کے ہنگاموں" کو بھول جاتے اور انھیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیر اقبال کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبال کے مطالعہ میں مصروف ہیں خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ٹھہری، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انھیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انھیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اب اقبال کو سمجھا ہے انھوں نے سمجھا ہی نہیں۔ وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں۔ "سفیر اقبال" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ آپ وہ پیام مشرق، ضرب کلیم، اور اسرار و رموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبال کی سیرت، فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضرب کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمے میں مجلس قلندراں کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا۔

اس مجلس میں ضرب کلیم، بال جبریل، ارمغان حجاز (حصہ اردو) جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد، بانگ درا، (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس ہے کہ کوئی مختصر نویس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور اس طرح کہا یا سنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبال پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جا سکتی۔ لیکن بقول غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سفیر اقبال نے دامن بھر بھر کے اس متاع فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ مجلس قلندراں ... ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا صرف اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آئندہ نشست میں ختم ہو جانا تھا، تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیر اقبال اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے امتیازات ختم کر دیئے جاتے پھر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیل مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ر دسمبر کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی فرزانے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیر اقبال پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو متشکل کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندران اقبال کے نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پہ لئے پھرتے تھے، اب کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا۔ مگر چہرے سنجیدہ تھے نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا

نہ کر ذکر فراق و آشنائی　　کہ اصل زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا　　دل دریا سے گہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی

کشادم چشم و بربستم لب خویش
سخن اندر طریق ما گناہیست

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیر اقبال اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا، وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا۔ جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیام اقبال اور تعلیم قرآن ہی کے صدقے میں تھا، ورنہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل ناآشنا ہو رہی تھیں۔ یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

هفت وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ ۲۳ اپریل ۱۹۵۵ء نمبر ۱۲

نشانِ منزل

سفر اور آوارگی، دونوں میں انسان کے قدم اٹھتے ہیں۔ وہ راستہ طے کرتا ہے، اس کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے۔ لیکن سفر کی ہر شخص تعریف کرتا اور اسے ضروری قرار دیتا ہے لیکن آوارگی انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سفر اور آوارگی میں فرق کیا ہے؟ ان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ سفر میں چلنے والے کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس، آوارگی میں، چلنے والے کے سامنے کوئی منزل متعین نہیں ہوتی۔ اس کا قدم کسی خاص سمت کی طرف نہیں اٹھتا۔ وہ یونہی کبھی ادھر کو ہو لیتا ہے کبھی اُدھر کو۔ اس طرح وہ دن بھر چلتا رہتا ہے۔ اپنے کام کاج کا ہرج کرتا رہتا ہے۔ وقت اور قوت صرف کرتا ہے لیکن اسے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا آوارگی کے معنی ہیں سفر بلا تعیینِ منزل۔

یوں تو جس زمانہ سے ان کی مرکزیت فنا ہوئی، تمام دنیا کے مسلمان فکر و نظر کی آوارگی میں مبتلا چلے آرہے تھے، لیکن بیسویں صدی کے رُبعِ اول میں، ہندوستان میں یہ بگولے کا رقص اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گیا تھا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کس طرح برق در آغوش کسی موہوم مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن اضطراب بن رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جو انہیں کسی وقت چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کچھ کانٹے ہیں جو ان کے تلووں میں بُری طرح چبھ گئے ہیں اور وہ ان کے پاؤں کو کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے۔ ایک حرکتِ پیہم اور سعیِ مسلسل ہے جس نے اس قوم کو یکسر سیماب پا بنا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ قوم مصروفِ جد و جہد تھی لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس جد و جہد کا مقصود کیا ہے۔ ان کے قدم اٹھتے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جا کدھر کو رہے ہیں؟ غیر تو ایک طرف، خود چلنے والوں کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ ہم کیوں چل رہے ہیں اور ہم نے جانا کہاں ہے؟ قوم تنہا نہیں چل رہی تھی، راہ نماؤں کے ساتھ جا رہی تھی۔ اُن راہ نماؤں کے ساتھ جن کے خلوص میں شبہ نہیں تھا۔ لیکن خود ان راہ نماؤں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم نے کدھر جانا ہے اور قوم کو کہاں لے جانا ہے۔

قوم اس سفرِ بے منزل میں مصروف جادہ پیمائی تھی، لیکن ایک سادہ سا انسان تھا جو ان سب سے الگ ہٹ کر، ایک گوشے میں بیٹھا، ایک کتاب کو سامنے رکھے پوری خاموشی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ قوم کے تیز خرام اسے آوازوں پر آوازیں دیتے، وہ ان کی طرف غم آلود آنکھوں سے دیکھتا اور پھر اسی کتاب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ شعلہ پیکر راہ نمایانِ قوم بے عملی کا طعنہ دے کر اسے اُس کی فکرگاہ سے باہر کھینچنے کی کوشش کرتے لیکن ان کے یہ کچوکے بھی ناکام رہتے۔ بڑی سے بڑی جاذبیت اور سخت سے سخت ہنگامہ بھی اس کی نگاہوں کو ایک ثانیہ کے لئے بھی اس کتابِ عظیم کے صفحات سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ وہ اسی طرح دریا کے تلاطم خیز اضطراب میں، سکوت و سکونِ گہر کے ساتھ، اپنی خلوت گاہ میں محو تفکر رہا، تا آنکہ سنہ ۱۹۳۰ء کی ایک شام وہ وہاں سے باہر نکلا اور ان رہ نوردانِ شوق کو الٰہ آباد کے مقام پر اکٹھا کر کے انہیں بتایا کہ تمہارا یہ سفر، سفر نہیں آوارگی ہے۔ اور یہ آوارگی ہی رہے گا جب تک تم اپنی منزل کا تعین نہ کر لو۔ تمہاری منزل یہ ہے کہ تم ایک خطۂ زمین حاصل کرو جس میں تم اس کتابِ عظیم کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکو۔ اس نے کہا کہ اگر یہ مقصد تمہارے سامنے نہیں تو تمہاری تمام جد و جہد بے سود اور تمام سعی و کاوش لا حاصل ہے۔ بے سود اور لاحاصل ہی نہیں، بلکہ سخت نقصان دہ اور ہلاکت انگیز ہے۔

پاکستان اس خطۂ زمین کا نام ہے، جو اس مردِ درویش کے دیئے ہوئے تصور کے مطابق اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا۔ یہ قوم کی انتہائی خوش بختی تھی کہ اسے عین اس وقت جب وہ اپنی بے پناہ "آوارگی" سے ہار تھک کر بیٹھ جانے کے قریب پہنچ چکی تھی، اسے اقبالؒ جیسا دانائے راہ مل گیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے ان کے لئے ایسی درخشندہ و تابناک منزل کا تعین کر دیا۔ لیکن اس کے بعد، اس قوم کی یہ انتہائی بدقسمتی تھی کہ جب اسے وہ خطۂ زمین حاصل ہوا تو اقبالؒ ان سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پھر اسی آوارگیٔ فکر و نظر کا شکار ہو گئی۔ پاکستان کی ہشت سالہ زندگی، اسی فکری تشتت اور ذہنی انتشار کی عبرت انگیز اور رسوا کن داستان ہے۔

اقبالؒ نے اس راہ گم کردہ قوم کے لئے صرف منزل کی نشان دہی ہی نہیں کی تھی۔ اس نے اس نقشے کے کچھ خط و خال بھی متعین کر دیئے تھے جس کے مطابق اس خطۂ زمین میں ایک قرآنی معاشرہ کو متشکل ہونا تھا۔ وہ حسین احمد صاحب مدنی کی نزاع کے سلسلہ میں اپنے زندہ جاوید جواب میں لکھتے ہیں:

> انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے، باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے، تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے .... نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

اسی طرح وہ ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

چونکہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق، پاکستان کو اس مقصدِ عظیم کا اولین گہوارہ بننا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ بنی آدم کی نشو و نما کے سلسلہ کا آغاز بھی خود یہیں سے ہونا تھا۔ اسی ضمن میں وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں (جو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) رقمطراز ہیں:

اس وقت حالت یہ ہے کہ آئین جدید (سنہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی لیڈروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو...

...... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ شروع میں تھا۔

جہاں تک پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کا تعلق ہے، وہ تبسم صاحب کے نام اپنے ایک خط میں (جو ستمبر ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا تھا) رقمطراز ہیں:

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور نوعِ انسانی کا سب سے بڑا خادم بھی وہی ہوگا.... زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔

یہی وہ موٹے موٹے خطوط جو اقبال نے اس نقشے کے لئے اپنی تحریروں میں چھوڑے ہیں۔ ان سے وہ نقشہ آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے جس کے مطابق پاکستان میں اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اقبال ان خطوط کو ہمارے لئے نہ بھی چھوڑ جاتا۔ یا انہیں ہم نا تمام پائیں۔ تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ خدائے حکیم کی وہ کتاب زندہ جس پر غور و فکر سے اقبال نے ان تصورات کو اخذ کیا تھا، خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر غور و فکر سے ہم پورے کے پورے نقشے کو مرتب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کچھ کر لیا تو پھر وہ مقصد حاصل ہوگا جس کے لئے اقبال نے اس خطہ زمین کے حصول کی تلقین کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور ہم نے سمجھ لیا کہ مقصود بالذات یہ خطۂ زمین ہی ہے خواہ اس میں کسی قسم کی حکومت کیوں نہ قائم کر لی جائے۔ تو یہ پاکستان نہ تو اقبال کے تصور کا پاکستان ہوگا اور نہ قرآن کی رو سے ایک مسلمان کی زندگی کا منتہائے نگاہ۔ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اسے آزادی نہیں کہا جائے گا۔ یہ غلامی بدترین قسم کی غلامی ہوگی۔ اقبال ہمیں آج بھی بار بار ان الفاظ کی یاد دلا رہا ہے جن پر اس نے (حسین احمد صاحب مدنی کے نام) اپنے جواب کا خاتمہ کیا تھا وہ الفاظ یہ تھے کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں ان ہی اصولوں پر ہوں جس پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے اور ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

لیکن یہ "دارالاسلام" مُلّا کے تصور کا دارالاسلام نہیں ہوگا، قرآن کے تصور کا دارالاسلام ہوگا جس کا (قائم کرنا تو ایک طرف، سمجھنا تک بھی مُلّا کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ اقبال کے الفاظ میں)

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب

بہرحال، اس وقت تو "اقبال کے پاکستان" میں یہی حالت ہے

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اور اس عیاری کا علاج، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اقبال کے سارے پیغام کا ملخص یہی ہے۔ اگر ہم اسے اپنی زندگی کا نصب العین نہیں بناتے تو اقبال کا نام جپتے رہنے سے کیا فائدہ ہے!

یوم اقبال

ہر کہ و مہ کو تسلیم ہے کہ پاکستان کا تصور حکیم الامت علامہ اقبال کا عطا فرمودہ ہے اس اعتراف کے باوجود ہر سال یوم اقبال آتا ہے اور اسے اس بے اعتنائی سے گذرنے دیا جاتا ہے جیسے کہ وہ عام ایام میں سے ایک یوم ہے اور اسے ویسے ہی ضائع کر دینا چاہیئے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد قدرے اس سے متعلق جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا لیکن جلد ہی یہ جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ قارئین ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ اس احسان ناشناس قوم نے اپنے محسنِ اعظم کو کس طرح لوحِ حافظہ سے محو کیا۔

طلوع اسلام نے ۱۹۴۸ء میں تاسیس پاکستان کے بعد پہلے یوم اقبال پر مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ اسے عام تعطیل قرار دیا جائے۔ لیکن اس سال کی فہرستِ تعطیلات میں اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ہم نے حکومت کی توجہ اس فروگذاشت کی طرف مبذول کرائی تو ۱۹ اپریل کے مراسلہ میں وزارت داخلہ نے ہمیں جواب دیا: "اس فہرست میں مزید اضافہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کے یوم وفات پر ۲۱ اپریل کو تعطیل عام کرنا بہت بعد از وقت ہے۔ ہاں اس بات کو نوٹ کر لیا گیا ہے اور جب ۱۹۴۹ء کی تعطیلات کا عام مسئلہ زیر غور آئے گا، اس پر مناسب غور کیا جائے گا۔" ہم نے جواب میں لکھا کہ اول تو حکومت کو ایسی فروگذاشت کا مرتکب ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا ہے تو تلافیٔ مافات کی جا سکتی ہے، اور اس کی مثال موجود ہے۔ مہاتما گاندھی کے قتل کی خبر ملنے پر حکومت نے تین گھنٹے کے اندر اندر تعطیل کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں ہمیں ۲۰ اپریل کا مراسلہ ملا جس میں تحریر تھا: "...... ۲۱ اپریل علامہ اقبال کی (تشکیل پاکستان کے بعد) پہلی برسی کا دن ہوگا۔ حکومت مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کی بے مثال عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند ہوں گے۔" خرابیٔ بسیار کے بعد ہی سہی، ہم نے اسے غنیمت جانا۔ لیکن اقبال کے "بے مثال عطایا کی یاد" میں صرف ایک ہی سال چھٹی دی گئی۔ ہم ہر سال یاد دلاتے رہے اور حکومت ہر سال اسے نظر انداز کرتی رہی۔

خیر اس کے بعد یہ بھی غنیمت تھا کہ ۲۱ اپریل کی تقریب پر ایک جلسہ گورنر جنرل ہاؤس میں منعقد ہوا اور ایک جلسۂ عام جہانگیر پارک میں، لیکن یہ بھی ایک مرتبہ ہوا۔ دوسری مرتبہ گورنر جنرل کے ہاں کی تقریب ختم ہو گئی اور جہانگیر پارک والا جلسۂ عام رسمی سا رہ گیا۔ سالِ گذشتہ جہانگیر پارک میں ایک پھیکا سا جلسہ ہوا۔ اب کے جو کچھ کراچی میں ہو رہا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے: ڈینسو ہال میں شام کے ۸ بجے ایک جلسہ "بزم اقبال و جوہر" کے زیر اہتمام؛ (وہ بھی نیم سرکاری) اقبال اکیڈیمی (۲۱ کی بجائے ۲۳ اپریل کو کراچی یونیورسٹی میں ایک جلسہ منعقد کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کم از کم کچھ اعلان اب تک نہیں ہوا نہ پبلک کی طرف سے نہ حکومت کی طرف سے۔

یہ عملی پہلو ہے اس زبانی اعتراف کا کہ پاکستان کے لئے اقبال کے عطایا بے مثال ہیں۔

یہ حالت صرف آٹھ سال میں ہو گئی ہے۔ ذرا اور وقت گذرنے دیجئے آپ کے بچے یہ بھی نہیں جانیں گے کہ اقبال کون تھا۔ اور زندہ قومیں کہہ رہی ہوں گی کہ "قوموں کی حیات

(باقی صفحہ ۷ کالم ۱ کے نیچے)

نظامِ پاکستان کے متعلق علامہ اقبال کا خط

قائدِ اعظم مرحوم کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبال کا دیا ہوا ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت، اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے پیچھے ہی پیچھے جا رہا ہے ...... اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما (DEVELOPMENT) دیجا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو کسی مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

بقیہ "لمعات" (صفحہ ۶ کے بعد)

ان کے تخیل پہ ہے موقوف"

کوئی ہے جو سوچے یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اس کا مداوا کیا ہے؟ یاد رکھئے کہ یومِ اقبال سے یہ مطلب نہیں کہ یہ یادگار ہے ایک ایسے آدمی کی جو سیالکوٹ میں پیدا ہوا اور کچھ عرصہ لاہور میں وکالت کرنے کے بعد، وہیں فوت ہو گیا۔ یہ درحقیقت یادگار ہے اس پیغام کی جس نے قوم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا اور صحرا میں کھوئے ہوئے قافلہ کو نشانِ منزل سے روشناس کرا دیا۔ اس یادگار کا دلوں سے محو کر دینا، اس پیغام کو بھلا دینے کے مرادف ہے۔ وذٰلک خسرانٌ المبین۔

سُرودِ رفتہ

(نوروز ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی طرف سے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ایک پیغام نشر ہوا تھا جو تہذیبِ حاضرہ پر ایک حقیقت افروز تنقید اور انسانی فلاح و فوز کی طرف راہ نمائی کے لئے ایک شمعِ ہدایت تھا۔ اس پیغام کو نشر ہوئے آج سترہ برس سے زائد عرصہ ہو گیا لیکن چونکہ کوئی حقیقت مرورِ زمانہ سے پرانی نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے یہ آج بھی ویسا ہی پیغامِ عبرت و بصیرت ہے جیسا اس وقت تھا۔ یہ آخری پیغام تھا جو اس دیدہ ور کی طرف سے اقوامِ عالم تک پہنچا، اور جسے ہم آج غم و مسرت کے مخلوط جذبات سے پھر اقوامِ عالم تک پہنچانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

پیغام

دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے، اور یہ فخر و ناز بلا شبہ حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور قوائے فطرت کی تسخیر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک اور پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچ جائے۔ انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، انکی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر ان کے درمیان تفرقہ انگیزی کر کے ان بدبختوں کو خونریزی اور برادرکشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش اور غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔

جو سال گزر چکا ہے، اس کو دیکھو اور آج نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو۔ حبش ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین، اس خاکدانِ ارضی کے گوشہ گوشہ میں یہی قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں اور ضعیفوں کے خون کے آخری قطرات تک چوس رہی ہیں۔ غرض ایک ہنگامۂ محشر ہے جس میں نفسی نفسی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام دنیا کے مفکر دم بخود ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر اس کرہ پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دے؟

یاد رکھو انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دُنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں گی۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی عقائد کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور نسل و

جنابِ رسالتمآب کا ادبی تبصرہ

علامہ اقبال

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں اُن سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا ادب اُن کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل اُنہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہ ہونی چاہیئے۔ یہ وہ عقدہ ہے جسے جنابِ رسالتمآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جنابِ پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی۔ اشعر الشعراء و قائدھم الی النار یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخئیلی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھائے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے۔ نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے، اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا،

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ
حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"۔

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دینوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گون کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دو جہاں صلعم (بابی انت وامی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے، ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے۔ یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت کو اس غایتِ آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہیں۔ صنعت گر کو چاہیئے کہ حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ مصورِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگار آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ مبتذل یا افسادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آگے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا، آپ نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقاء کیا ہونی چاہیئے۔

ملک خداداد کا تصور (صفحہ ۹ کا بقیہ)

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی۔

نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود
این زمین و آسمان دیگر شود

یہ ہے اس نظام کا تصور جسے علامہ اقبال قرآنی نظام سمجھتے تھے۔ جاوید نامہ کے دیگر مقامات اور حضرت علامہ کی دوسری تصانیف میں اس نظام کے خط و خال بڑی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں جنہیں کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا۔ ہماری کس قدر شورہ بختی ہے کہ حضرت علامہ پاکستان کا تصور تو دے سکے، لیکن وہ اس وقت ہم میں موجود نہ ہوئے جب اس کے نظام کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو پاکستان کا نظام خود مرتب فرماتے۔ اور کسی کو مجالِ اختلاف نہ ہوتی۔ لیکن اس باب میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، حضرت علامہ کے تصورات کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن ہمارے ہاں ہر وقت زندہ ہے۔ ہم آج قرآن کی روشنی میں اپنا نظام خود مرتب کر سکتے ہیں، جو وہی نتائج برآمد کرے گا جس کا نقشہ حضرت علامہ نے اپنے عالم تصور میں کھینچا ہے یعنی

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست

اس کی تشریح میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

کا امتیاز کاملاً مٹ جائیگا۔ انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

آؤ اس نئے سال کو اس دعا سے شروع کریں کہ خدا ہمارے بزرگ و برتر اربابِ حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور انہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔ آمین ؎

"ملکِ خداداد" کا تصوّر

(اقبالؒ کے نزدیک)

علامہ اقبالؒ نے "جاوید نامہ" میں اپنے مختلف تصورات کو مختلف طرق و اسالیب سے پیش کیا ہے کہیں مکالمات کی شکل میں، کہیں مشاہیرِ سلف کے ارواح کی زبان سے، کہیں کسی مقام کی کیفیات کا نقشہ کھینچ کر، کہیں خود اپنے واردات کے خط وخال بیان کر کے، ایک مقام پر انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جب دنیا میں آئینِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرت قائم ہوگا، تو اس وقت خطۂ ارض کی حالت کیا ہو جائے گی۔ انھوں نے اس خطہ کے مثالی بیان کے لئے فلکِ مریخ اور مرغدین کا شہر منتخب کیا ہے جسے وہ "ملکِ خداداد" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش   خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش گل، نرم طبع۔ سادہ پوش، تسخیرِ قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (ENERGY) سرچشمہ حرارت (آفتاب) سے براہ راست حاصل کرنے والے۔

فکرشاں بے دود سوزِ اکتساب   رازدانِ کیمیائے آفتاب

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور   چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد نوعِ انسان کی خدمت ہوگا۔ نہ کہ حصولِ سیم و زر، سکوں کا اس مقام پر رواج ہی نہ ہوگا۔

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر   کار ہا را کس نمی سنجد بزر

کس ز دینار و درم آگاہ نیست   ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھواں دھار بنا رہی ہوں گی، مشینیں خدمت گذار، دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت۔

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست   آسماں ہا از دخاں ہا تیرہ نیست

وہاں کا ہر کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا، نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا حاصل کوئی اور چھین کرلے جائے گا۔

سخت کوش دہقاں چراغش روشن است   از نہابِ دہ خدایاں ایمن است

کشت و کارش بے نزاعِ آبجو است   حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست

چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا۔ اس لئے باہمی مفاد کا تصادم (CLASH OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا۔ اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا، ہر طرف امن ہی امن ہوگا اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMY) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں   نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

وہاں کے اہلِ قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں مصروف نہ ہوں گے۔

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ   از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نہ وہاں کوئی بے کار ہوگا نہ گداگر

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش   نے صدا ہائے گدایاں دردِ گوش

ایک شہر میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم، نہ کوئی کسی کا آقا نہ غلام، نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ تھا اقبالؒ کے الفاظ میں مرغدین کا نقشہ جہاں آئینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب وہاں کے حکیم نے مجھ سے کہا کہ اس جگہ نہ سائل ہوتا ہے نہ محتاج۔ نہ حاکم نہ محکوم۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ہم (اہلِ مشرق کے مذہب پرست) یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ امیری اور غریبی، حاکمی اور محکومی سب خدا کی طرف سے ہے۔ یہ سب باتیں تقدیر سے متعلق ہیں تو یہاں یہ کیسے ہے کہ سب ایک جیسے ہیں یہاں لوگوں کی تقدیریں مختلف کیوں نہیں، کیا تم لوگوں نے تدبیر سے تقدیر کو مٹا دیا ہے؟

سائل و محروم تقدیرِ حق است   حاکم و محکوم تقدیرِ حق است

جز خدا کس خالقِ تقدیر نیست   چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

اس کے جواب میں حکیم مریخی نے کہا کہ تم لوگوں نے تقدیر کا مطلب ہی غلط سمجھ رکھا ہے۔ تقدیر کے معنی ہے پیمانہ، خدا کے ہاں مختلف پیمانے رکھے ہیں۔ جتنی ہمت تم کروگے۔ وہ پیمانے سے ناپی جائیگی اور اس پیمانے کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ اس لئے اگر کوئی ایک پیمانہ تمہاری ضرورت کو پورا نہیں کرتا تو اپنی ہمت کو بڑھالو، دوسرا پیمانہ مل جائے گا۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست   زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

تم لوگوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا۔ کارگہِ ہستی میں انسانی ذات کے مؤثرات کو فراموش کر دیا، اور سمجھ لیا کہ سب کچھ کہیں اوپر سے ہوتا ہے۔

ارضیاں نقدِ خودی در باختند   نکتۂ تقدیر را نشناختند

آؤ تمہیں سمجھاؤں کہ تقدیر کسے کہتے ہیں، تقدیر سے مقصود ہے خدا کا قانون، جس قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ اسی قسم کا قانون اس پر منطبق ہو جائے گا۔ یا یوں سمجھو کہ تقدیر نام ہے کسی شے کے جوہرِ ذاتی (INTRINSIC CHARACTERISTICS) کا۔ جس قسم کے یہ جوہرِ ذاتی ہوں گے اسی قسم کے خواص اس چیز سے مرتب ہوں گے۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

رمز باریکش بحرفے مضمر است   تو اگر دیگر شوی او دیگر است

یہ نہ کہو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ کہو کہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جیسے تم بن جاؤ گے، اسی قسم کا خدا کا قانون تم پر عاید ہو جائے گا۔

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا   سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست   قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

اگر تم تقدیر کو اس طرح سے سمجھو تو کائنات کے گنجِ گراں مایہ تمہارے قبضے میں ہوں گے۔ لیکن اگر تم نے تقدیر کا مفہوم وہی رکھا جو "مذہب" کے غلط تصور نے پیدا کر رکھا ہے تو اس سے محتاج محتاج تر اور کمزور کمزور تر ہوتا جائے گا۔

اصلِ دیں ایں است اگر اے بے خبر   می شود محتاج از محتاج تر

یہی وہ مذہب ہے جو انسان کو سلا دیتا ہے

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا   باز در خوابِ گراں دارد ترا

کہو! یہ دین ہے یا افیون؟

سحر و افیون است یا دین است ایں   حبِ افیون است یا دین است ایں

※

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصور تمام فسادات کی بنیاد ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے۔

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست   مرغدیاں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے۔

ارضِ حق را ارضِ حق دانی بگو   چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا[1]

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے خدا کی ملکیت میں دیدی جائے

کس امانت را بکارِ خود نبرد   اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ   تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

یہ تمام محتاجی، غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا است   آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

باقی صفحہ پر

[1] لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا۔ زمین میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد پھر سے ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

اقبال کا پاکستان

اس وقت پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ ہر طرف سے مختلف قسم کی آوازیں اٹھ رہی ہیں کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ پاکستان کا تصور، حکیم الامت علامہ اقبال کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے وہی بتا سکتے تھے کہ اس خاکہ میں کس قسم کا رنگ بھرا جائیگا۔ پاکستان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ اقبال کی قیادت سے محروم رہ گیا۔ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو وہ اپنے تصور کو قرآن کی روشنی میں عملی شکل عطا کر دیتے۔

ہر چند ہم میں آج اقبال موجود نہیں لیکن اقبال کی فکر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس فکر کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کا نقشہ کیا ہونا چاہیئے تھا۔ ذیل میں ہم فکرِ اقبال کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لئے نشاناتِ راہ کا کام دے سکیں۔ ان میں سے کئی چیزیں اس سے پیشتر قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے آچکی ہیں لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں، ان کی افادی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھئے کہ اقبال کے نزدیک اس نقشہ کے خطوط کیا تھے۔

قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال سے پوچھا کہ: "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کرکے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انھوں نے فرمایا: "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔ (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۱ء)

مقامِ حدیث

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے، اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے۔ اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہو کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عاداتؐ اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کردے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا انطباق اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انھیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہو کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبال ص۱۶۲-۱۶۳)

احکامِ قرآنیہ کی ابدیّت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو ان[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہوچکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کرکے ان کو الگ کردیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضیکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعۃ القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

مسلمانوں کا نصب العین

الفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحیدِ الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشہ میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہوسکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پرور ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشا الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھیئے بلکہ

---

[1] مولانا خواجہ احمد الدین صاحب

یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے۔ کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امّت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں متعلقہ قومیت)

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ ریان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ در اصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے انھیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔ نسل اور حدود و ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ در اصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب ـــ متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی")

(۲)

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امّت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا روم نے:

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اساس انتخاب کا؟ وہ تحریکِ اصلاح، غیر مسلم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ۔ یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(حسین احمد مدنی کے جواب میں ـــ مضمون متعلقہ وطنیت)

(۳)

نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے، یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہو وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانیے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے، جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں ـــ مضمون متعلقہ وطنیت)

عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہو۔ انسانیت کا نصب العین شعر و فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں۔ تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب ـــ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

(۲)

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت طلب و جستجو صرف ایک چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضا بھی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب ـــ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ نہیں؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی احساسات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا۔ کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے

منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً یہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے' اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحب اردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر انکا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولیں نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے' لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے' الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

———(۲)———

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

اسلام اپنے اُصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب حسین احمد مدنی ——— متعلقہ قومیت)

———(۳)———

اُمت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دین قیم ہے۔ دین قیم کے الفاظ میں ایک عجیب غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

ملائیت' تصوف' ملوکیت

۱۔ ملائیت :- علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرورکے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانہ سے وہ بیحد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی اُمور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افزا تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے معلمین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا۔ کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے

۲۔ تصوف :- مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبے سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور ضعف اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں۔ جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت :- مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی۔ اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت ——— بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائیگا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

اسلام ایک طرح کی سوشلزم ہی

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھکر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہو یعنی افیونی خواص رکھتی ہے' اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء)

یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی۔ عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہو کہ آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما (ڈویلپمنٹ Development) دی جا سکتی ہے اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش Subsistence ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے متخالف نہیں۔ اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں۔ جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائداعظم محمد علی جناح۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل!
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساوات شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردید خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا ساز و برگِ امتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے الا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اے کہ می بینی نبرد باد و جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا است
جملہ موجودات را فرماں روا است

الارض لله

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
صحبتش تا کے تو بودِ او نبود — تو وجود و او نمودِ بے وجود
تو عقابی طائفِ افلاک شو — بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطنِ الارض للّٰہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
من نگویم در گذر از کاخ و کوے — دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بو
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن — نورے از خود گیر و بر نارش بزن
از طریقِ آزری بیگانہ باش — بر مرادِ خود جہانِ نو تراش
دل برنگ و بوے و کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ حق دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد! — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
بردہ چیزے کہ از آنِ تو نیست — دانم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گو تو باشی صاحبِ شے می سزد — ور نباشی خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا است — آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست — شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست
اے کہ منزل را نمی دانی ز رہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
تا متاعِ تست گوہر گوہر است — ور نہ سنگ است از شرارے کمتر است
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب روئے نرم خوئے سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوز اکتساب — راز دانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کار ہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درہم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست — حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرز و بومش گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ
نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش — نے صداہائے گدایاں در دو گوش
کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

حاصلِ مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

ابلیس کی زباں سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

یہ ہو اقبال (اور قرآن) کے مطابق پاکستان کا صحیح نقشہ اور اسی کے مطابق ہونا چاہیئے اس کا دستور۔

روٹی کا مسئلہ

(اقبال کی نظر میں)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا۔ کیونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ماپے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہوگا۔ جب مسلمان اقبال کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہوگئی ہے کہ اقبال "دیارِ غیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دورانِ سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلاء پُر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سنا دی۔ یوں یاد قائم رکھی جا رہی ہے اُس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑیئے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہوگئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آسکتی تھی

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے لیکن اقبال کے الفاظ میں مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں روبہ عمل لانے کی"۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انھیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

اقبال نے جو کچھ سمجھا، قرآن سے سمجھا، اور جو کچھ سمجھایا، قرآن سے سمجھایا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعیّن چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعیّن کرتی جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہو۔ وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے۔ روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا، اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقلِ انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے "خضرِ راہ" میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ ؎

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟ اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

الغرض اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھئے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف اور یہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکش اہرمن لشکری شہریار از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
وارثِ پیرِ کنشت، شیشِ تاج، کلیسا، وطن جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفۂ اضداد پیش کرتا ہے: اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رو" کی چابکدستی قرار دیکر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومتے مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ——— نیاید ز محمود کارِ ایاز ——— اور مزدور ایک پرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج بہ پرویز پر کار نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر دمی نہد ز من باغِ بہشت سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک آنچہ در شکمِ او از آنِ من وز خاک تا بہ عرشِ معلّیٰ از آنِ تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم زبورِ عجم میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب!

"بالِ جبریل" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہ ہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنھیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنھیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لیلے جبکہ غریب اور آس

کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا۔ اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) کہ:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب جیسی کہ وہ جاوید نامہ میں افغانیؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل   یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است   قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را   در شکم جویند جانِ پاک را
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس   بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب   ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج   درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل   ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لا اور اِلّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کش مکش کے بارے میں کہتا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں   از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است   تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ اند ر مقامالش نگاہ!   لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ
فکرِ او در تندِ بادِ لا بماند   مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

نکتۂ می گویم از مردانِ حال   امتاں را "لا" جلال "اِلّا" جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات   لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون   حرکت از لا زاید از اِلّا سکون
در مقامِ لا نیاساید حیات   سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ امتاں   نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلّا کے معنی ہیں۔ اس کی جگہ ایک صحیح نظام کو قائم کرنا یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے اور مستقل اقدار تنہا عقل کی رو سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر   سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ   در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی   دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام   بگزر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جویندۂ   تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے   جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبال کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب   فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو   لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ   ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو خالی تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

آید آں روزے کہ از زورِ جنوں   خویش را زیں تندباد آرد بروں

چنانچہ اقبال اپنے ایک خط میں جو انھوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا اور جو ۳۱ر جولائی کے سول اور ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔"

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمھاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا۔ کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کش مکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پہ غور کرو۔ اس سے تمھیں قرآن ایسی راہنمائی دے دیگا جس سے نہ صرف یہ کہ تمھاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمھارے حصہ میں آ جائے گی چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور   فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر   کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرف "قُلِ الْعَفْو" میں پوشیدہ ہے اب تک   اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ؎

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت   ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

ده خدایا نکتهٔ از من پذیر　　رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است　　ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمین بردن رواست　　این متاعِ "بندہ و ملکِ خداست"
آب و نانِ ماست از یک مائدہ　　دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

بالِ جبریلؒ میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جہاں لکھا گیا ہے کہ:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون — ؟　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟　　خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں　　تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اقبالؒ پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جا سکے، چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائدِ اعظم کو ایک خط لکھا کہ:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے........ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے........ شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے........ اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا........ ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

یعنی اقبالؒ کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلامک سوشلزم کا نفاذ کیا جا سکے۔ جیسا کہ اقبالؒ کو خود اندیشہ تھا۔ لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر گھبرا رہا ہے کہ جس قرآنی نظام کی طرف "طلوعِ اسلام" دعوت دیتا ہے، وہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ جس کا کچل دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ تمہارے لئے گھبرانے کی بات نہیں۔

"اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے........ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عاید کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں۔ جو شریعت کے جائز ٹھہرائے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں...... جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز، اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔"

(مسئلہ ملکیتِ زمین از ابو الاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۵۲-۵۳)

ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے قرآن کے ان حقائق کو اپنے معاشرہ کی بنیادیں قرار نہ دیا تو کمیونزم کا طوفانِ بدتمیزی نہ معلوم انھیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ اس کا ایک نتیجہ تو ہم نے ابھی ابھی مشرقی بنگال میں دیکھ لیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ خطرہ کیا شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی بابت بھی بہتر ہو کہ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں سنئے، جو کہا گیا ہے ــــ

کشمیر ـــ اقبالؒ کی نظر میں

اقبالؒ کو کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ کشمیری الاصل تھے۔ حسنِ فطرت کی فراوانی اور "تیز بین و پختہ کار و سخت کوش" اہالیانِ کشمیر کی مظلومیت نے اقبالؒ کے قلبِ حسّاس سے کشمیر کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دی۔ اقبالؒ نے جا بجا کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کا جائزہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے جو آج کی قلیل مہلت میں ممکن نہیں۔ اسے آئندہ فرصت پر اٹھا رکھتے ہوئے کشمیر سے متعلق کلامِ اقبالؒ کے کچھ ٹکڑے بلا تبصرہ پیش کئے جاتے ہیں۔　　(طلوعِ اسلام)

میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔　　(ایک مکتوب)

کشمیر کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں کہ میں واقعات کے اس پس منظر کو بھی بیان کروں جو اس ملک میں حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا بظاہر اچانک قیام جس کا شرارِ خودی قریباً مردہ ہو چکا تھا۔ باوجود ان مصائب کے جو اس قیام کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ہر اس شخص کے لئے مسرت کا باعث ہے جس کی نگاہ عصرِ حاضر کی ایشیائی تحریکاتِ آزادی کے محرکات پر ہے۔ اہالیانِ کشمیر کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ہونہار اور ہنرمند قوم کا اپنے تشخص میں اعتماد کا از سرِ نو احیا آخرکار نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ہندوستان بھر کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ سب سے زیادہ قابلِ مذمت فرقہ وارانہ منافرت ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اہلِ کشمیر سے قدرتی دلچسپی سے ہندوؤں نے جوابی تحریک شروع کر دی ہے جس کا مقصد ازرہِ یاس یہ ہے کہ پان اسلامزم اور برطانوی تسلط کے ہوّے کھڑے کر کے کشمیر کی بری حکومت کو بچایا جائے۔　　(خطبہ مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء)

خوشا روزگارے خوشا نو بہارے　　نجوم پرن رست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بالِ تذروے　　ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل　　نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لبِ جو خود آرائی غنچہ دیدی　　چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے　　کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد　　ز آوائے سارے ز بانگِ ہزارے
نواہائے مرغِ بلند آشیانے　　در آمیخت با نغمۂ جویبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را　　نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را　　رہا سازد از محنتِ انتظارے

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیش ما بردارد ش　　پیش قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

کس قدر دور رس تھیں اس مردِ حق آگاہ کی نگاہیں اور کیسا دردمند تھا اس مردِ مومن کا قلبِ حساس۔ کتنی محبت تھی اسے انسان اور مسلمان سے، اور کیا عشق تھا اسے خدا کے کلام سے

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم — شرابے، کتابے، ربابے، نگارے
سرت گردم اے ساقیٔ ماہ سیما — بیار از نیاگانِ ما یادگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را — فروزد چو نورے بسوزد چو نارے
شقائق بروید از خاکِ ژندم — بہشتے فرو چیں بدشتِ غبارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں — ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشمِ امم ریختہ آں اشکِ نابے — کہ تاثیرِ او گل دماند ز خارے
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب — مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و میر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھرتھراتا ہے جہانِ چار سوئے رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر — کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں — عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں — حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم — مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور — وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار — ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش — کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک — گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے — بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل — گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے — کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے — نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک — خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی — تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا — دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا — دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی — رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد — ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں ز اہلِ خطہ سوزد چوں سپند — خیزد از دل نالہ ہائے دردمند

زیرک و دراک و خوش گل ملتے است — در جہاں تر دستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست — در نے من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است — در دیارِ خود غریب افتادہ است
دست مزد او بدستِ دیگراں — ماہیٔ رودش بہ شستِ دیگراں
کارواں ہا سوئے منزل گام گام — کارِ او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد — آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنیں — جبہ را ہموارہ سود است ایں چنیں
در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است
کوہ ہائے خنگ سار او نگر — آتشیں دستِ چنار او نگر

در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ — خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن — پنبہ پراں از کمانِ پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب — من خدا را دیدم آنجا بے حجاب
مرغکے می گفت اندر شاخسار — با پشیزے می نیرزد ایں بہار
لالہ رست و نرگسِ شہلا دمید — بادِ نوروزی گریبانش درید
عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر — نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بر بست و کشاد — خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی — حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند — قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامن گیرِ ماست — مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست
خاکِ ما را بے شرر دانی اگر — بر درونِ خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست — ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست
ایں ہمہ باد است کز تاثیرِ او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو

توز اہلِ خطہ نومیدی چرا؟

دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست — اخگرِ شاں زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تا بینی کہ بے آوازِ صور — ملتے برخیزد از خاکِ قبور
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر — بر کش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم — از نوا تخریب و تعمیرِ امم
تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

جہاز ہوٹل
(اینڈ ریسٹورنٹ)

نزد ٹی اسٹیشن عقب کاٹن ایکسچینج۔ پردہ دار۔ ہوادار رہائشی کمرے۔ خالص گھی کے عمدہ کھانے
قرآنی فکر و نظر والے اصحاب کی عمومی نشستگاہ ہے۔

ملک غلام کبریا منیجر

درِ منثور

ان موتیوں میں سے چند موتی جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

اسلام تقدیر کا محتاج نہیں۔ وہ بجائے خود تقدیر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

تاریخِ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب کہ توحیدِ انسانیت کے دنیاوی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک توحیدِ انسانیت کا اصول گوشت و پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قلبِ انسانی میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو۔ ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہوگا کہ اسلام قدرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو قدرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سد ہٹنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جو اس نے تشکیل دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے معیّن کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعرا، فلاسفہ، ہیثیوں سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے ہیں اور انھیں خوش آیند و درخشاں بناتے ہیں یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے لگاؤ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو مشلول کر دیتے ہیں اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔

(بیان متعلقہ احمدیت)

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے وارداتِ روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق ــــ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علما میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے۔ اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

(میجر سعید محمد خاں کے نام خط۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں)

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی حد تک زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۰ء)

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیام مشرق)

جو قوم دوسری اقوام سے متعلق جذباتِ نفرت رکھتی ہے ذلیل اور رذیل ہے۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکر خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جنہیں میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک ہی محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

(قائد اعظمؒ کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں۔ اور نچلے درجے کے عہدے وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کما حقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔ (قائد اعظم کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔ (منشی سراج الدین کے نام خط۔ ۱۹۱۵ء)

ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ شعرائے عجم نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع البقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم نے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ (علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہیں میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے، جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال رہا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فن شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ (پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (۱) خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست ۔۔۔ کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۵ء)

اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوع انسانی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوت عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔

(پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

ضرب کلیم

[ذیل میں ضرب کلیم (عربی) کا تعارف پیش لفظ اور مقدمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی افادیت آج بھی وہی ہے جو وہ تحریر تھی۔ طلوع اسلام]

مقدمہ

خدایا! ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبال کے فارسی دیوان "پیام مشرق" کا عربی ترجمہ تقریباً دس ماہ میں تیار ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرھویں برسی کے موقعہ پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلس اقبال نے یوم اقبال کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبال کے کلام کا یہ ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخر کار وہ منزل آ گئی جس کی طرف میں نے بارہا قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سد راہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیام مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ المشرق" نے پاکستان کے اہل علم، ادیب اور سیاسی طبقوں میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور عربی خواں طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوان کو بھی عربی میں منتقل کروں اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ابتدا کی تھی، جاری رکھنے اور اس کے لئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ "رسالۃ المشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیام مشرق" کے ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کے لئے "جاوید نامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحت سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی صاحب مثنوی کو اپنا دلیل راہ بنایا ہے۔ اس لئے میں نے کسی لیس و پیش کے بغیر "پیام مشرق" کے بعد "جاوید نامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبال کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبال کی صحبتیں میسر رہی ہیں اور انہوں نے اقبال کے تعارف اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔

ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا کہ میری رائے ہے کہ آپ "ضرب کلیم" کا ترجمہ کریں۔ جو اقبال کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے۔ "ارمغان حجاز" کے سوائے جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضرب کلیم" میں اقبال کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے۔ اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاوید نامہ" ایک طویل مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے، اور صرف ان لوگوں کے لئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرہ وافر میسر آیا ہو۔ "جاوید نامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا اس کے برعکس "ضرب کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے، اور ایک فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ ضربِ کلیم میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہو۔ محترم دوست ہیم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاوید نامہ پر ضربِ کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ الحمد للہ کہ

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ، تحقیقِ مطالب اور اس کی تعبیرات پر غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں۔ اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارت خانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں۔ اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسر نہ آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔ اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سدِ راہ نہ ہوں، ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک مجلس سے اس وقت تک نہ اٹھیں جب تک آئندہ نشست کے لئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہمیں ان کی شرکت کے لئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

میں فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم سید عبدالواحد (انسپکٹر جنرل جنگلات حکومتِ پاکستان) جو مصنفِ اقبال اور اس کی سیرت پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں، اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبال دوست احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شرکت کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ان میں مجلسِ اقبال کے دوسرے ارکان اور اس کے صدر چودھری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس وقت پاکستان کے وزیرِ صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخِ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے۔ اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبال کی بحث تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہونچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو 'مجلسِ اقبال' یا 'مجالسِ اقبال' کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے 'درویشانِ اقبال' اور 'قلندرانِ اقبال' کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ اور غلام احمد پرویز صاحب 'شیخِ درویشاں' و 'شیخِ قلندرانِ اقبال' تھے۔

عید الفطر کے بعد ۱۳۷۰ھ میں ہم نے 'ضربِ کلیم' کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسبِ ذیل کلمات لکھے:

"شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔
اول و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روحِ اقبال پر رحم فرمائے۔"

تین ماہ میں کتاب ختم ہو گئی۔ اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شب دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۳ھ (۱۶ جون ۱۹۵۴ء) کو 'ضربِ کلیم' کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی اور جب میں اس کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی۔ میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے:

"اللہ تعالیٰ نے شب یک شنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۴ھ (۱۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی۔"

اس طرح تقریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعۂ کتاب کے ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسر آ گئی۔

'پیامِ مشرق' کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں، ان کی مکافات کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کے لئے میں نے مصر کو ترجیح دی۔ چنانچہ سفرِ وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۶ دسمبر کو وطن مالوف پہنچا تو سفرِ پیہم اور کثرتِ مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کے لئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضل عزیز محمد جعفر الجبالی (ٹیکس انسپکٹر حکومتِ مصر) نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لے لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔ میں نے شکرگزاری کے ساتھ ان کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیامِ وطن کے دوران میں مکمل ہو جائے تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کر سکوں اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم و تبدیل کا فرض بھی انجام دوں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیز محترم جناب جبالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجتے رہنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر اقبال کی تمنا میرے ذریعہ بر آ رہی ہے، اور اقبال کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہو کر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں 'ضربِ کلیم' کو عربی لباس میں پیش کر رہا ہوں۔ جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقعہ پر میں نے 'پیامِ مشرق' کے ترجمہ کی پیشکش کی تھی۔

بارہا میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اقبال کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کروں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیقِ الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو سکے گا اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

اس توفیقِ عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر و سپاس ہے اور اسی سے توفیق و الہام اور راستکاری کی التجا کی جاتی ہے۔ وھو حسبی و نعم الوکیل۔

عبدالوہاب عزام۔ کراچی ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ

تعارف

'ضربِ کلیم' اقبال کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکنِ جماعت، دین، تربیت، ادب و سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ و تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعری صف میں شامل کر دیا ہے۔ کائنات کی ہر وہ حقیقت شعر بن جاتی ہے، جو انسان کے جذبہ و وجدان سے آب و رنگ حاصل کر لیتی ہے۔ یا جس کو انسانی تخیل ایک خاص شکل و صورت میں نمایاں کر دیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعاتِ شعر اس دائرہ کے خطِ محیط سے مرکز تک مرتب و منظم ہیں۔ بعض موضوعات خطِ محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے، جو اس دائرہ سے خارج ہوں۔ بعض موضوعات شعریت میں زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ و تخیل کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خالص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

'ضربِ کلیم' میں بعض اوقات اقبال کا کلام شعر کی صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو تجریدی حقائق سے قریب تر ہے۔ اور بعض مرتبہ خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکزِ شعر کی بہ نسبت خطِ محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر 'پیامِ مشرق' کی بہ نسبت مجھے 'ضربِ کلیم' کے ترجمہ میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی۔ کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسنِ شعر پھیکا نہ ہو جائے اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبال نے حقائقِ فلسفیہ کے چہرے پر ڈالی ہے کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی یہ ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کلام نغمہ موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضربِ خارا شگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے، جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے ؎

* زور دستِ ضربتِ کاری کا ہے مقام   میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ اندازِ تخیل اور تازگیِ فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے' اور شاید اس طرح وہ انشا پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے۔ جو ایک سنجیدہ اور متین اسلوبِ شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آئی ہیں۔

ابواب و فصول

شاعرِ مشرق نے ضربِ کلیم کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے' اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں (والیِ بھوپال) کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے قاری سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور مسلمان　　　(یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)
(۲) تعلیم و تربیت
(۳) عورت
(۴) فنونِ لطیفہ　　　(یہ اس دیوان کی دوسری طویل فصل ہے)
(۵) سیاستِ مشرق و مغرب
(۶) محرابِ گل افغان کے افکار

فلسفۂ اقبال

اس موقعہ پر اقبال کے فلسفہ کے متعلق چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے۔ جو اقبال کے مقاصد عالیہ اور اس کا منتہائے نظر سمجھنے میں پڑھنے والوں کے لئے ممد گار ثابت ہوں گے۔ اقبال کے فلسفہ کی اساس وہ تصور ہے۔ جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے۔ جس کا نام اسرارِ خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ:

(ا) خودی جوہرِ کائنات ہے۔ نظامِ کائنات کی بنیاد اور اس کا سرِ حیات ہے۔

(ب) حیاتِ خودی مقاصد اور امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔

(ج) عشق آرزو، سعیِ پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔

(د) جہادِ مسلسل اور جہدِ پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے۔ اور جھجک، تردد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دستِ طلب بڑھانے سے اجتناب کرے، اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو۔ جو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے، اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے شاید ۔۔۔ اشیا کی حسی اور معنوی قوتوں کا دلدادہ ہے اور اس لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفانِ روح سے بے بہرہ رہا۔ اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے۔ قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اور اس لئے اقبال کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا ؎

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　　نگاہ چاہیئے اسرارِ لا اِلٰہ کے لئے

اقبال کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے ؎

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی　　　کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　　نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں ؎

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ　　　کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں ؎

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل　　　جو ہو نشیب میں پیدا وہ قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ 'رموزِ بیخودی' میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ ایک فرد توی کس طرح جماعت سے وابستہ رہ کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح برقرار رہتا ہے۔ 'ضربِ کلیم' میں وہ 'مردِ بزرگ' کے عنوان سے ایک قطعہ میں کہتا ہے ؎

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علٰی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ وسخر لکم ما فی الارض جمیعا۔ وسخر لکم الانہار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنہار واتاکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر ہے یا آثارِ قضا پر جاری ہے

ایک مومن آزاد اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلح و فساد اور بقا و فنا کا معیار ہے ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے　　　دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانونِ طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　　مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تہذیبِ جدید

اقبال کہتا ہے۔ یورپین تہذیب محض مادی ہے۔ جس میں نہ قلب ہے نہ روح۔ اقبال نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلاسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے۔ وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوعِ انسانی کے باہمی ربط و ائتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے، اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے

اقبال کا فلسفہ 'ضربِ کلیم' میں

خودی اور عناصرِ خودی کے متعلق اقبال کا فلسفہ اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور ان کے علاوہ اس کے دوسرے حکیمانہ افکار و آراء یہاں تک کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ 'ضربِ کلیم' کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثارِ طبیعت میں اپنا نقشِ خودی نمایاں کرے ؎

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے　　　آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر

'ضربِ کلیم' اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبال نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلیدِ خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بیباکانہ کود پڑنے کا محرک ہے ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے　　　وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

اس کا دعوٰی ہے ؎

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم　　　عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

وہ کہتا ہے ؎

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے　　　ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے　　　تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ:

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

اقبال کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ احتیاجِ معاش اور احساسِ متاعِ دنیوی کی حاجت مندی کا نام ہے۔ جس کو انسان اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہے۔ بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ ہے کہ نفس ہوسِ ملک اور حرص و طمع کی قیود سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیش قدمی کرتا ہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کر سکے۔ بسا اوقات فقیر سیم و زر کے انبار کا بھی مالک ہو سکتا ہے اور بہت مرتبہ صاحبِ سطوت بادشاہ بھی لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کر سکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے
قشیری نے اپنے رسالے میں یحیٰی ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ:
"فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو"

شبلی کا بیان ہے کہ:
"فقر کی ادنٰی ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لیتا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے"

رسالۂ قشیریہ میں ایک دوسرے موقع پر کہا گیا ہے:
"صحتِ فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقیر کی احتیاج ہو

کسی چیز کے حصول سے استغنیٰ میسّر نہ آئے۔"

سہروردی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"جب فقر الی اللہ درست ہو جاتا ہے تو غنا غنی باللہ میسّر آتا ہے، یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی۔"

ان بیانات سے واضح ہے کہ فقر ملک و مال کے فقدان کا نام نہیں ہے۔ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ نہ ہو جن کو وہ پا لیتا ہے یا کھو دیتا ہے یعنی یہ کہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبال کہتا ہے:

همت ہو اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا! بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری

پیش لفظ

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا نام "ضربِ کلیم" رکھا، اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی: "اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف"

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب "ضربِ کلیم" ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصّہ کے مفسّر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے۔ تو وہ دو اہم حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصّہ غیر انقلاب ہے۔ اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگ زمین کی صورت میں عین اسلام بنا کر اس امّت پر مسلّط کیا۔ جو ان غیر قرآنی تصوّرات کو نکالنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی۔ یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انھیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملّتِ مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیں مجوس کی غلامانہ نسل پرستی، یہود کی تشریعی شریعت و رسومات، رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آور خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے۔ اور اس طرح یہ ملّت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیٔ عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصّہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصّہ اس فتنہ کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا۔ جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان امڈے چلا آ رہا تھا۔ اور جس کی تموّج انگیز طغیانیاں ملّتِ اسلامیہ کی شاد و کوخس و خاشاک کی طرح بہائے لے جا رہی تھیں "ضربِ کلیم" اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و حشاک کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟

اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں، اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدّین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے۔ حیات کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ:

(ا) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشو و نما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے ان جواہر مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدّ و جہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، نسلی، لسانی اور طبقی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اُصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ جنھیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے، اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و استقلالِ ملّت کے محکم تصوّر سے انسان اور کائنات، انسان اور انسان، اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے انسانی معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ ربّ العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشو و نما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہستی کھیلتی رقص کرتی شاداں و فرحاں اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصویر کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے ... ات وجود میں آگئی ہے اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر و شر جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ (قوم) کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العینِ حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے۔ اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و ذرائع اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصّہ پاگل خانہ میں گزارنا ہوگا اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں مصروفِ پیکار رہتی ہیں۔ یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اقبال اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ کو بالخصوص اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے "ضربِ کلیم" جس سے اقبال بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا۔ بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ نبوّت کی روشنی میں خاکدانِ دنیا کی ان محفوظ اور بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمین ... فوز و فلاح کے

چشمے اور آسمان سے رشد و سعادت کے منّ و سلوٰی اترتے ہیں۔

پیامِ اقبال کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم صاحب السعادت عبدالوہاب عزام بک کی مُخلصانہ اور پُرجوش سعی کے تصدّق سنگنائے اُردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادباں کشاں ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت شرمندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے۔ اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملّتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے اتنا دُور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر تخمِ صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اصلہا ثابت و فرعہا فی السّماء کہا گیا تھا۔ اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شرقیۃ و لا غربیۃ سے تعبیر کیا گیا تھا۔

اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بار آوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے، اور یہی پیامِ اقبال کا مقصود و منطوق ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِّ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنھیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معنے سمجھ میں نہ آئیں اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یا درویش، قلندر، مردِ حر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے 'خودی' ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنے پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معنی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبال کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے۔ اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں لیکن چونکہ 'ضربِ کلیم' میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئیگا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ "کیا انسان کی انفرادیت (شخصیت، یا انا) کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟" دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون اعظم کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلّی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا، یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلّی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا۔ جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سُلا دیا۔

اقبال نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا۔ اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلّی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے' اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک 'جوں جوں انسان' اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہو جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس ، اور اس طرح اس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی' موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنابریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے، شر ہے۔

اقبال کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عِلّتِ حیات اور اصل قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد ——— دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے حصولِ مقصد کے لئے اسی تپش و خلش کا نام اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جدّ و جہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اوّل: اطاعت' اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ (الیاکتفاعت، زائد قوتوں کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے۔ جس میں تضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہونچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجربہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو) یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقام اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچکر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر' درویشی یا قلندری ہے یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفت صمدیت اور "غنی" عن العالمین کا مظہر ہو۔ ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ، پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

میانِ امتاں والا مقام است   کہ آں امت دوگیتی را امام است
نیا ساید ز کارِ آفرینش   کہ خواب و خستگی بروئے حرام است

اور

بیاغاں عندلیبے خوش صفیرے   براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیر او بسلطانی فقیرے   فقیرے او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا۔

(پرویز)

مجلس قلندراں (صفحہ سے آگے)

اتفاق سے اس دن "پس چہ باید کرد" کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا، جس کا عنوان ہے "در حضورِ رسالت مآبؐ"۔ ایک طرف اقبال حضورِ رسالت مآبؐ میں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف شیخِ قلندراں اور سفیرِ اقبال دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضورِ ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر والہانہ کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہو۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفل سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے، وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ یہ تصویر آپ کو ٹائیٹل کے صفحہ پر نظر آئے گی۔ باقی رہا ریکارڈ، سو جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ وہ اسے اپنے لئے فردوسِ گوش بنا لیتے ہیں

یہ آخری محفل اس کیف بار وعدہ حیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حریمِ کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب ان قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے۔ اور جس سے آنے والے دن ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔

یہ نقوش بھی اسی کاروانِ اقبال کے ہیں جو چار برس تک اس طرح مصروفِ جادہ پیمائی رہا۔ کس قدر درخشندہ ہیں یہ نقوش. طلوعِ اسلام اسی گلِ بداماں راستہ کا ایک سنگِ میل ہے۔

تلمیحاتِ اقبال

مفکرینِ مغرب

(محترم ممتاز حسن صاحب)

اقبال اور مفکرینِ مغرب کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہے کہ کسی اور ایشیائی شاعر یا فلسفی کو نصیب نہیں ہوا اس تعلق کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو اقبال یورپ کے ادب، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے طالبِ علم ہیں۔ اور دوسری طرف اس فلسفے اور تہذیب کے سب سے بڑے ناقد بھی وہی ہیں۔ اور اقوامِ مشرق کو ان کا یہ مشورہ کہ:

بایدایں اقوام را تنقیدِ غرب

ان کے پیغام کا نہایت اہم جزو ہے۔ تہذیبِ مغرب کے متعلق ان کے تاثرات ان کے سارے کلام میں پھیلے ہوئے ہیں ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ۔۔۔ جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ۔۔۔ مرد بیکار، زن تہی آغوش

اقبال کی تصنیفات میں مفکرینِ مغرب کے افکار و اقوال عام طور پر محض تلمیحات یا اشارات کے طور پر وارد نہیں ہوتے بلکہ وہ اقبال کے ذہنی اور روحانی پس منظر کا ایک مستقل حصّہ ہیں، اور اقبال کے کلام کا بیشتر حصّہ انہی افکار سے دست و گریباں ہے۔ انھوں نے مفکرینِ مغرب سے بہت کچھ سیکھا ہے' اور جو سیکھا ہے اس کی خوب جانچ پرکھ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مغربی ادب اور فلسفے کا تذکرہ عموماً تلمیحاتی نہیں ہے' بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے۔ اقبال کے ذہنی اور روحانی ارتقا میں مشرق اور مغرب کا جو حصّہ ہے اسے خود اقبال نے واضح کیا ہے ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ ۔۔۔ سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

چونکہ اقبال کے پیغام کا ماحصل عقل و خرد کی پرستش نہیں، بلکہ عشق و ایمان کی پیروی ہے' اس لئے یوں نہیں کہا جاسکتا کہ اقبال پر مغرب کا بھی وہی احسان ہے جو مشرق کا ہے مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر اقبال کو مغربی مفکرین اور مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا موقعہ نہ ملتا۔ تو ان کے فلسفے اور تعلیم کا رنگ وہ نہ ہوتا جو ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صورت میں اقبال' اقبال ہی نہ ہوتے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر سب سے پہلے جو یورپین اثر پڑا، وہ سر ٹامس آرنلڈ مرحوم کا تھا۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ اور اگرچہ خود کسی خاص طرزِ فکر کے حامل نہیں تھے، مگر علم اور علمی تحقیق کے میدان میں بلند درجہ رکھتے تھے، ان کی صحبت میں اقبال کے علمی ذوق کی خوب پرورش ہوئی۔ اور مغربی مفکرین سے اقبال کے تعلق کی بنیاد یہی تھی۔ اقبال نے آرنلڈ کے ولایت واپس چلے جانے پر "نالۂ فراق" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ اس سے استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کے خلوص کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ۔۔۔ آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت ۔۔۔ اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اقبال ۱۹۰۵ء میں ولایت تشریف لے گئے۔ اور انگلستان اور جرمنی میں تین سال کے قیام کے بعد واپس آئے اس عرصہ میں انھوں نے یورپ کے ادب، فلسفے اور تہذیب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور اس مطالعے نے ان میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کردی۔ مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے آپ کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور انھوں نے دیکھا کہ اس تہذیب کا ظاہری حسن و جمال مشرقی تہذیب سے زیادہ نہ تھا۔ اس انکشاف کے بعد ان کے دل میں اسلامی اقدار کے علاوہ کسی اور قدر کے لئے جگہ نہ رہی مگر وہ اہلِ یورپ کے علمی تجسس اور ذوقِ تحقیق کے ہمیشہ معترف رہے۔ اور یورپ کے ادب، فلسفے کا مطالعہ انہوں نے آخر وقت تک جاری رکھا۔

اقبال کے کلام میں پورے کے پورے مغربی فلسفے اور مختلف یورپین زبانوں کے بہترین ادب کے اثرات ملتے ہیں۔ مفکرین میں کانٹ، ہیگل، شوپن ہار، نیٹشے، کارل مارکس، برگساں، میک ٹیگرٹ، الگزینڈر، برٹلے، آئن سٹائن، اور شعرا میں بائرن، گوئٹے، ٹینیسن، پٹوفی، ہائینے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے تصورِ خودی کی تشکیل میں شاید میک ٹیگرٹ کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ میک ٹیگرٹ کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور اقبال کے استاد تھے۔ ان کے فلسفے میں 'انا' یا "EGO" کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے، اور انھوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ ایک 'انا' دوسرے 'انا' سے قطعاً جدا اور متمیز ہے اور دو 'انا' کا ایک دوسرے میں مدغم ہوجانا ناممکن ہے۔ یہی تخیل اقبال کی خودی میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ اقبال نے اس بنیاد پر جو عمارت قائم کی ہے، اس کا میک ٹیگرٹ کے فلسفے سے تعلق نہیں۔

دوسرا یورپین مفکر جس نے اقبال کے فلسفے پر اثر اندازی کی ہے نیٹشے ہے۔ نیٹشے اور اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اگرچہ ابھی تک اس مضمون کا پورے طور سے احاطہ نہیں کیا گیا۔ نیٹشے دراصل فلسفی کم ہے اور شاعر زیادہ۔ اس کے اقوال میں ایک حرارت اور ایک والہانہ پن جو محض فلسفے کی چیز نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات کو کہیں بھی ایک منظم صورت میں پیش نہیں کیا۔ اقبال نے اپنے چھ لیکچروں میں اپنے فلسفے کو جس باقاعدہ طور سے ترتیب دیا ہے' وہ نیٹشے کے ہاں نایاب ہے۔ اقبال نیٹشے کے Übermensch یا مافوق الانسان کے تخیل سے متاثر ہوئے ہیں۔ مگر صرف ایک حد تک نیٹشے کا Übermensch محض قوت کا مظاہرہ ہے۔ اقبال کا نصب العین اس سے بلند ہے۔ وہ زور اور قوت کو مستقل اقدار کے تابع رکھتے ہیں۔ ان کا انسانِ کامل ایک دردمند دل پہلو میں رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایسے اصولوں کے پابند ہے جو وقتی مصالح اور زمانے کی مقتضیات سے تغیر پذیر نہیں ہوتے اور چونکہ مستقل اقدار وہی ذات متعین کرسکتی ہے جو خود تغیرات و حوادث سے ماورا ہو۔ اس لئے اقبال کا انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کا مقام عبودیت ہے۔ نیٹشے خدا کا منکر ہے اور اسی وجہ سے اس کے مافوق البشر کے سامنے اپنے اور اپنی بے راہ روی کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں۔ اقبال نے نیٹشے کے متعلق کہا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں ۔۔۔ تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال نے اپنے انسانِ کامل کا تصور اگر کہیں سے اخذ کیا ہے تو وہ قرآن سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ماخذ کوئی ہے تو رومی ہے یا ایک حد تک عبد الکریم الجیلی کی تصنیف "الانسان الکامل" مگر نیٹشے کے اثرات بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ 'اسرارِ خودی' میں حکایت الماس و زغال نیٹشے کے اقوال زردشت سے ماخوذ ہے۔ اور راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم "از گروہِ گوسفندانِ قدیم" والا سارا حصّہ بھی نیٹشے کے خیالات کا پرتو ہے۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ دنیا کی غلام قومیں اپنے آقاؤں کو زیر کرنے کے لئے عام طور پر یہ حربہ استعمال کیا کرتی ہیں۔ کہ اپنی غلامانہ تہذیب کے اقدار کو ان پر مسلط کریں۔ اور انھیں ان اقدار کی فوقیت سے مرعوب کریں۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے کہ بھیڑیں شیر سے کہیں کہ گھاس کھانا تہذیب کی بلندی ہے' اور گوشت کھانا تہذیب کی پستی۔ اور شیر بھیڑوں کی یہ بات مان لے۔ اقبال نے اسی خیال کو 'اسرارِ خودی' میں نقل کیا ہے۔

اسرار کے آخری حصّہ میں جہاں اقبال نے اپنے مردِ کامل سے خطاب کرکے کہا ہے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا ۔۔۔ اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

تو اس خطاب میں بھی نیٹشیانہ رنگ ہے۔ پیامِ مشرق میں "پند باز بابچۂ خویش" میں بھی یہی رنگ ہے۔ یا بالِ جبریل' میں جہاں عقاب کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر! ۔۔۔ وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

تو وہاں بھی یہی انداز جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں نیٹشے کے مطالعہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ایک اور یورپین مفکر جو ایک حد تک اقبال پر اثر انداز ہوا ہے' برگساں ہے۔ جزئیات کو چھوڑ کر کہا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں عقل و عشق کے متقابل تصورات برگساں کے Reason اور Intuition کا عکس ہیں۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے' اقبال کا عشق برگساں کی Intuition کی نسبت رومی کے تصورِ عشق سے زیادہ قریب ہے اور شاید رومی کا کلام ہی اس کی بنیاد بھی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اقبال نے برگساں کا مطالعہ گہرے طور سے کیا ہے' اور اپنے چھ لیکچروں میں برگساں کے مختلف خیالات کی تنقید کی ہے۔ انھیں برگساں کے فلسفۂ وقت میں خاص طور سے دلچسپی ہے اور وہ اس کا مقابلہ مختلف صوفیا کے خیالات و تجربات سے کرتے ہیں۔

گوئٹے اور اقبال کا تعلق بھی ایک مستقل مضمون ہے جس کا ابھی پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اقبال کا 'پیامِ مشرق' تمام تر گوئٹے کے دیوانِ مغرب کا جواب ہے۔ اس کتاب میں جو شاید فنی اعتبار سے اقبال کا شاہکار ہے، اقبال کا مغرب سے تعلق پورے طور سے واضح ہوتا ہے بلکہ اقبال نے قریب قریب ہر اس مغربی مفکر اور شاعر کا الگ الگ ذکر کیا ہے جس سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ گوئٹے کی ایک نظم نغمۂ

کا ترجمہ 'پیامِ مشرق' میں شامل ہے۔ جو یقیناً فارسی زبان کی بہترین نعتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اس کے علاوہ کہیں کہیں اور بھی گوئٹے کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر 'نوائے وقت' کی نظم میں اقبال وقت کی زبان میں فرماتے ہیں ؎

من کسوتِ انسانم ۔۔۔۔ پیراہنِ یزدانم

اس کے مقابلے میں گوئٹے کے 'فاوسٹ' میں اس شعر کو دیکھئے:

Thus at times humming loom my hand prepares
The garment of life that the Deity wears.

یہ بیرڈ ٹیلر کا ترجمہ ہے۔

گوئٹے کے کلام میں خودگری اور خودنگری کا تخیل موجود ہے۔

Be Self-possessed
That is the only art of life.

یہی تخیل اقبال میں بھی جھلکتا ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ گوئٹے کے کلام کو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حال اقبال کے تصورِ شیطان کا ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو صفات مثلاً عقل اپنے شیطان کے لئے منتخب کی ہیں۔ وہ گوئٹے کے 'فاوسٹ' کے شیطان یعنی Mephistopheles کی صفات سے مشابہ ہیں۔ لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کے تخیل کی بنیاد گوئٹے پر ہے۔ کیونکہ صوفیانہ افکار میں اس قسم کے خیالات عام ہیں۔ جن میں عقل کو شیطان سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ افکار اقبال کیلئے گوئٹے کی تصنیف کی بہ نسبت زیادہ قریب تھے۔

اقبال کے جاوید نامہ کے متعلق اکثر اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا پلاٹ دانتے کی (Divine comedy) سے ماخوذ ہے۔ شاید دانتے کی تصنیف کا اثر اقبال پر ایک حد تک ہوا ہو مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ خود دانتے کا یہ تصور رسولِ کریم کے معراج کے واقعے اور ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ پر مبنی ہے بہرحال دانتے کا مقصد جنت اور جہنم کے تفصیلی مناظر پیش کرنا تھا۔ اس کی تصنیف میں تاریک گہرائیاں ہیں۔ لپکتے ہوئے شعلے، جھلستی ہوئی روحیں اور تڑپتے ہوئے قلوب نظر آتے ہیں۔ اور اس کا تصور ان محسوس پیکروں سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے برعکس اقبال کے جاوید نامہ میں اس قسم کی تفصیلی تصاویر ناپید ہیں۔ انھیں مختلف روحوں اور ان کے مختلف مقامات سے واسطہ ہے اور وہ ان روحوں سے جو مکالمہ کرتے ہیں۔ اس سے مقصود ہمارے لئے ایک مستقل پیغام ہے۔ 'نالۂ ابلیس' کے عنوان سے جاوید نامہ میں جو نظم ہے وہ اس قدر بلند اور دورِ حاضر کے انسان پر اس قدر کڑی گہری اور لطیف تنقید ہے کہ اس کی مثال دنیا کے ادب میں کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔ کم از کم دانتے، گوئٹے وغیرہ کے ہاں تو کوئی مثال نہیں ہے۔

اقبال کے تاثراتِ مغرب کے متعلق ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس عنوان کے ضمن میں اقبال کا سارے کا سارا کلام زیرِ بحث آ جاتا ہے۔ میں صرف چند اشارات کر سکا ہوں۔ اور ابھی بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت اور نظریۂ وقعت کے متعلق اقبال کے خیالات۔ آسوالڈ سپنگلر کی تصنیف انحطاطِ مغرب میں اسلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس پر اقبال کی تنقید یا مارکس اور لینن کی اشتراکیت کے متعلق اقبال کے تاثرات وغیرہ۔ اس کے علاوہ اقبال کی شاعری میں جابجا مغربی شعراء کے کلام کے ترجمے ہیں اور کہیں کہیں خفیف اشارے۔ مثلاً اقبال کی ایک پرانی نظم میں جس کا عنوان ہے "فراق" دو شعر ہیں ؎

کیفیت ہے میری جانِ ناشکیبا کی ۔۔۔ میری مثال ہے طفلِ صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز ۔۔۔ صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

ان اشعار میں ٹینیسن کے In memoriam کے مشہور اشعار کی خفیف سی جھلک ہے۔

So runs my dream, but what am I
An infant crying in the night,
An infant crying for the light
With no language but a cry.

اقبال کے کلام کے مغربی عناصر کے متعلق بہت سی غلط رائیں قائم کی گئی ہیں۔ اقبال کی نگاہ اپنے خود مستقل اقدار کے تابع تھی۔ اور انھوں نے مشرق و مغرب سے جو کچھ اخذ کیا ہے۔ ان اقدار کی وضاحت یا تائید کے لئے کیا ہے۔ کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت | از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم | از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان | اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں کی تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام | اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۴۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام | از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے | روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت | از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے | ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر سات سالہ دورِ آزادی کی سمجی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے ۸ آنے

مزاجِ شناسِ رسول | یہ کون بتلائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول؛ مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث | حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ | از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات | از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

تمام کتب ہیں مجلد ہیں۔ اور گرد پوش سے آراستہ

اسلامی معاشرت

از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے

محصول ڈاک ہر حالت میں بذمت خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۔ کراچی

یوم اقبال پر تازہ پیشکش

✡ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انھیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

☆ نظام ربوبیت (پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے
اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی
ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔
رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔
چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے
دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط معہ گردپوش۔ چھہ روپے
قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے
دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے اُنھیں
قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں یا قسم
دوم لینا چاھیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۳ ۔ کراچی

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound Bunder Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lin
Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM